© rasailojaraid.com

مستشرقین اور اسلامی کلچر

مغرب میں کلچر خصوصاً اسلامی کلچر کا جو مطالعہ کیا گیا وہ اس تصوّر کے پیش نظر ہُوا کہ ابتداء میں علوم طبعی مدوّن ہو گئے اور ان کے نظامہائے علم بن گئے اس کے بعد دو چیزیں سامنے آئیں ایک انفرادی نفس اور دوسرے اجتماعی نفس۔ انفرادی نفس کا مطالعہ نفسیات کے سپرد ہُوا اور وہ ایک نظام علم بنا، اور اجتماعی نفس کا مطالعہ عمرانیات یا SOCIOLOGY کے سپرد ہُوا اور قدیم تہذیبوں کا مطالعہ اس نظر سے کیا گیا کہ جو آثار قدیم تہذیبوں کے موجود ہیں ان کے حوالے سے اجتماعی نفس کو سمجھنے کی سعی کی جائے۔ اور چونکہ تمام تہذیبوں کی ابتداء مشرق ہی میں ہوئی تھی اس لئے ان کا مطالعہ کرنے والے افراد مستشرقین کے نام سے یاد کئے گئے۔ مستشرقین میں چند گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جن کا نقطۂ نظر خالص علمی تھا اور وہ تہذیب و ثقافت کو یا کلچر کو بحیثیت مظہرِ نفس اجتماعی سمجھنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کا ذہن یہ تھا کہ اسلام بھی نینوا، بابل، مصر اور ہند کی قدیم تہذیبوں کی طرح ایک مٹی ہوئی تہذیب ہے جس کے متعلق سوال یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے اسباب عروج و زوال کیا ہیں؟ ان کے نزدیک اس کا جو جواب مسلّم تھا اور جو مفروضہ انہوں نے اسلامی تہذیب کے عروج کی توجیہہ کے لئے اختیار کیا وہ میکانی اصول علّیت یعنی HYPOTHESIS OF MECHANICAL CAUSATION کا مفروضہ تھا۔ اسلام کی توجیہہ کو انہوں نے یہ صورت دی کہ اسلام سے پہلے کی جو تہذیبیں ہیں ان کا اثر اسلامی تہذیب پر پڑا اور اسلامی تہذیب نتیجہ ہے ماقبل اسلام تہذیبوں PRE-ISLAMIC CULTURES کا۔ اس نقطۂ نگاہ کے پیش نظر انہوں نے معاشرت کو اور ادب کو جاہلیت کا نسلی ورثہ قرار دیا۔ فلسفہ اور حکمت کو یونانی افکار سے ماخوذ قرار دیا، فقہ یعنی قانونِ شریعت کو رومن ROMAN LAW یا یہودیت سے ماخوذ قرار دیا اور اخلاق و تصوف اور مذہب کو مسیحیت سے ماخوذ جانا۔ اس طرح نقطۂ نظر یہ تھا کہ اسلام کے تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کوئی پہلو اسلام کا اپنا نہیں ہے ہر چیز دوسرے نظامہائے افکار اور دوسری تہذیبوں سے مستعار لی ہوئی ہے جن مستشرقین نے اسلامی کلچر پر غور کیا ان میں دوسرا گروہ ان مسیحی مبلغین کا تھا جنہوں نے تہذیب کے میدان میں اسلام کے خلاف محاذ کھول دیا۔ خود ولیم میور کے بقول جب انہیں صلیبی محاربات میں شکست ہو گئی اور انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام مسیحیت کے مقبول ہونے کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے اور اسلام کو ناقابل قبول ثابت کرنے کی جب تک کامیاب کوشش نہیں کی جائے گی۔ مسیحیت مقبول نہیں ہو گی۔ چنانچہ مسیحی مبلغین نے اسلام کا مطالعہ اس نظر سے شروع کیا کہ اس کے خلاف نفرت پھیلائی جائے اور اس کے تمام ثقافتی اور تہذیبی فضائل کا سرچشمہ ماقبل اسلام تہذیبوں کو قرار دے کر یہ بتایا کہ اسلام کا اپنا کچھ نہیں ہے یہ سب انہوں نے ہم سے لیا ہے۔

اس کے بعد مستشرقین کا ایک اور گروہ آیا جو یہودیوں پر مشتمل تھا۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ یہودیت کی تجدید کے لئے عبرانی کا مطالعہ کریں اور عبرانی زبان کا مطالعہ کرنے کے بعد ان پر یہ بات کھلی کہ مسلمانوں نے عبرانی ادب میں بھی بے اندازہ کام کیا ہے اس کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو سمجھنے کے لئے عربی علم و ادب کے مطالعہ کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے یہ تہیہ کیا کہ اسلام کا مطالعہ اس کے اصلی ماخذ سے کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے عربی پڑھی اور عربی پڑھنے کے بعد انہوں نے اس عناد کے ساتھ جو یہودیت ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے، اسلامی عقائد، اسلامی تصورات، اسلامی شخصیات، اسلامی قانون، اسلامی ادارت، اسلامی روایات، اسلامی تحریکات، اسلامی مقامات اور اسلامی تاریخ میں جو واقعات تھے ان سب کا مطالعہ اس انداز میں پیش کیا کہ اس میں اسلام کی تنقیص پائی جائے اور جہاں کہیں ان میں سے کسی مستشرق میں فراخدلی نظر آتی ہے۔ اس کا بھی سبب یہ ہے کہ جب اسے یہ منظور ہو کہ آنحضرتؐ کی تنقیص کرے تو حضرت ابوبکر صدیق کی تعریف کرتا ہے یا وہ جب بھی آنحضرتؐ کی تنقیص کرنا چاہتا ہے تو امام غزالی کی عظمت بیان کر کے اپنے لئے یہ موقع پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ مستشرقین کا ایک اور گروہ ہے جس نے اسلامی تہذیب کا اور اسلامی کلچر کا مطالعہ کیا یہ گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو استعمار پرستی کے نمائندے ہیں اور ان کا مفاد یہ ہے کہ عالم اسلام کے مختلف حصے اور مسلم اقوام جو ان کے استعماری عزائم کی راہ میں رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہیں دور کرنے کے لئے یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی قوت اور ان کے ضعف و قوت کے اسباب کو سمجھنے کے لئے انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصانیف کے ذریعے اثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا ماضی چاہے جتنا تابناک ہو مگر ان کا مستقبل بغیر مغربی اقوام کا سہارا لیئے تاریک رہے گا۔ مستشرقین کا ایک اور گروہ تھا جس کے پیش نظر یہ تھا کہ اسلامی تہذیب کے جو فضائل اور جو آثار باقی رہ گئے ہیں انہیں اس انداز میں پیش کیا جائے کہ یہودیوں اور مسیحیوں کا عناد مسلمانوں کے خلاف پھر ایک بار مشتعل ہو اور انہیں وہ مٹانے کے لئے پوری شدت سے کام لیں۔ مستشرقین کا ایک اور گروہ وہ ہے جو اس وقت میک گل، پرنسٹن، کیمبرج، آکسفورڈ اور واشنگٹن وغیرہ میں ... کام کر رہا ہے۔ یعنی اسلامی کلچر پر ریسرچ میں مصروف ہے۔ ان لوگوں کا مدعا یہ ہے کہ قیادت تو مسیحیت کے ہاتھ سے نہ نکلے اور اشتراکیت کے محاذ پہ مسلمانوں کو اپنی موافقت میں کھڑا کرنے کی تدبیر دریافت ہو سکے۔ وہ تمام مختلف محرکات جن کی بنا پر اسلامی کلچر کا مطالعہ مستشرقین نے پیش کیا ہے اس مطالعے کو ایک بہت ہی متعصبانہ رنگ دے دیتے ہیں یہ مطالعہ اسلام کا غیر جانبدارانہ مطالعہ نہیں ہے اور ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے ہر جدید تعلیم یافتہ کی رسائی صرف انہی مآخذ تک ہے جو مستشرقین نے پیش کئے ہیں۔ ایک سبب اس کا یہ بھی ہے کہ مدعا پورا کرنے کیلئے مستشرقین نے دسیسہ کاری کے انداز میں تمام شواہد ہمارے ہی ادب سے حاصل کئے ہیں۔ کیونکہ مذہبی مسائل میں ہمارے سوچنے کا جو روایتی انداز ہے اس میں ایک التباس ہے اور ہمیں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ہمارے کس انداز سے ہمارے ہی عقائد کی تخریب ہو رہی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے جو ہدایت دی تھی اور اس نے جو چیلنج پیش کیا تھا۔ اس کا دعوی قرون اولی میں اور صحابہ کے دور میں پورا ہو چکا۔ یہ خلافت راشدہ کا دور تھا۔ اور اب زوال کا دور ہے اور وہ اس میں مسیحی اندازِ فکر سے متاثر ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی اہتمام اب تک تسلی بخش انداز سے اسلامی تاریخ کی تعبیر پیش کرنے کا نہیں کیا گیا ہے۔

تاریخ کے دو تصورات ہیں ایک تصور کہ تاریخ، واقعات ماسبق کا ایک بیان ہے اور دوسرا تصور یہ ہے کہ تاریخ قوموں کے عروج و زوال کی توجیہہ کا علم ہے۔ یہ تصور کہ تاریخ واقعات ماسبق کا بیان ہے اور بس، اصل میں ایک فرسودہ تصور ہے اور تاریخ کا صحیح تصور یہی ہے کہ "تاریخ قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی توجیہہ کا علم ہے"۔ اب اس تصور کے سلسلہ میں کئی نظریات پیدا ہوتے ہیں: ایک نظریہ جو میکانی نظریۂ کائنات یعنی MECHANISTIC VIEW OF UNIVERSE. سے پیدا ہوا ہے یہ ہے کہ اس کائنات کا نہ کوئی مقصد ہے نہ اس کی حرکت کا کوئی رخ اور سمت ہے جس سے قریب تر یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دور تر ہونے کا سوال پیدا ہو۔ اس لئے نہ کائنات کے حرکت و عمل میں کوئی معنی ہیں اور نہ اُسے عروج و زوال ہے تاریخ کا یہ نظریہ MECHANISTIC VIEW OF UNIVERSE سے پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ کا ایک اور نظریہ یہ ہے کہ تاریخی حرکت بتدریج انسان کو اس کے زوال کی طرف لے جا رہی ہے یہ نظریہ مسیحی علم کلام میں معصیت اولیٰ کے تصور کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ اس کی رُو سے تاریخی حرکت، زوال کی حرکت ہے۔ اس کے بعد ایک اور نظریہ مدون ہوا وہ یہ ہے کہ تاریخی حرکت بتدریج انسان کو اس کے عروج اور کمال کی طرف لے جا رہی ہے یہ نظریہ حیاتیاتی علوم کے زیر اثر مفروضۂ ارتقاء کی بنا پر قائم ہوا۔ اس میں پھر دو میلان پیدا ہوئے۔ ایک یہ کہ "یہ ارتقائی حرکت خط مستقیم کی صورت میں ہے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جدید ترین، کامل ترین ہے اور جو تصور جتنا قدیم ہے اتنا ہی فرسودہ اور ناقابل قبول ہے۔ تعبیر تاریخ کا دوسرا میلان جو اسی ارتقائی نظریہ کی بنا پر پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ تاریخ کی حرکت فی الجملہ ہے ارتقائی اور وہ بتدریج انسان کو کمال کی طرف لے جا رہی ہے لیکن ہر قدم جسے ترقی کا قدم کہا جا سکتا ہے اس میں بے شمار نشیب و فراز پائے جاتے ہیں۔ اس میں بے شمار ٹھوکریں ہیں اور غلطیاں ہیں، شکستیں ہیں اور ناکامیاں ہیں مگر فی الجملہ وہ ارتقائی حرکت ہے۔ وہ تمام لوگ جو تاریخ کی اس حرکت کو خط مستقیم کی صورت میں قبول کر لیتے ہیں جس کی نمائندگی اس دور میں ٹوائن بی نے کی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک فرسودہ نظام ہے اور یہ کہ یہ قابل عمل اور آئندہ کے لئے نتیجہ خیز نہیں ہے۔ نیز اس کی حقیقت صرف تاریخی ہے اور جیسے کہ ایم۔ این رائے کا خیال ہے کہ اسلام اگر کچھ تھا بھی تو اُس کا یہ کارنامہ تھا جو اس نے تاریخ میں انجام دے دیا اور اس کا مستقبل کوئی نہیں ہے۔ ہمارے اپنے لوگ بغیر سوچے سمجھے جب ان نظریات کو قبول کر لیتے ہیں تو پھر اپنے مستقبل کی نسبت بغیر مغربی اقوام کا سہارا لئے انہیں سوائے مایوسی کے کچھ نظر نہیں آتا، اور اس چیز نے ہمارے معاشرے کے اندر ایک اختلال پیدا کیا ہے۔

ٹوائن بی اور ایم۔ این رائے دونوں کا خیال یہی ہے کہ اخلاق اور سیاست کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے اور دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ معاشی رکاوٹ ہر جدوجہد میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشی مفاد سب سے بڑا مفاد ہے اور اگر ہم نے اپنے حریفوں کا مدعا پورا ہونے دیا تو اس میں ہماری موت ہے۔ اس لئے راسخ العقیدہ فکر جدید ذہن کی کوشش کو بار آور ہونے نہیں دیتا اور جدید ذہن راسخ العقیدہ اندازِ فکر رکھنے والوں کی سعی کو بار آور نہیں ہونے دینا چاہتا۔ یہ مشکل اس لئے پیش آئی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ جو راسخ العقیدہ فکر ہے اس کی ساری کامیابی اور عظمت کا جو تعلق ہے وہ اسلام کا نام لینے سے اور اسلام کی وابستگی کے ساتھ ہے اس لیے وہ اسلامی فضائل کا انضار تو نہیں کر سکتا اور چونکہ ماضی میں اس ذہن کے نمائندوں کو ایک اہمیت حاصل رہ چکی ہے اس لئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک بہترین جماعت ہیں اور سیاسی اعتبار سے اقتدار کے حقدار ہم ہیں۔ آج بین الاقوامی سطح پر راسخ العقیدہ انداز فکر رکھنے والوں کو جو اضمحلال ہے اس کی بنا پر وہ ہر حلقۂ درس سے ہر کتاب کے دیباچے سے اور ہر منبر سے یہ تلقین کر رہے ہیں کہ حق کو شکست ہو گئی ہے اور باطل غالب آگیا ہے۔ اس کا رد عمل اس نام نہاد جدید ذہن پر یہ ہے کہ حق تو ہوتا ہی وہ ہے جسے شکست نہ ہو۔ اس لئے یا تو ہم اسلام سے دستبردار ہو جائیں یا اسلام کی ایک ایسی تعبیر لائیں کہ جو اس جدید تہذیب سے سازگاری کرنے میں اسلام کو رکاوٹ نہ بننے دے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر معاذ اللہ خدا کی طرف سے سو فی صد حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دینے کی اجازت ہو جائے تو وہ سوچیں کہ کیا وہ اس ملک کی معیشت کو اپنے دشمنوں کی گرفت سے آزاد کرا سکتے ہیں اور یہ نہیں کر سکتے تو کوئی اجتہاد اس مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا۔ قومی استحکام اور ترقی کے لئے راسخ العقیدہ ذہن کے درمیان جو مفاہمت ضروری ہے اس میں رکاوٹ کے لئے اجتہاد ایک مابہ النزاع تصور کے طور پر اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان اتحاد نہ ہو سکے اور قوم کا معاشی مسئلہ حل نہ ہونے پائے معاشی اعتبار سے پسماندہ ممالک اور اقوام مغربی استعمار کی گرفت کے اندر رہیں اور اس گرفت سے نجات نہ پا سکیں۔ اس طرح ان کے درمیان نہ تنظیم ہو گی، نہ اتحاد عمل ہو گا نہ ہی کوئی نتیجہ برآمد ہو گا۔ اس لئے اجتہاد دونوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کی تدبیر ہے۔ ورنہ اجتہاد آخر کس چیز کے لئے کیا جائے؟ یہ ہے دینی اور فکری التباس جس نے اس نتیجے کو الجھا دیا ہے کہ اس اسلامی کلچر کیا ہے؟ اگر ہم اسلامی کلچر کے اوپر اس انداز سے غور کریں کہ کلچر یا ملت یا ثقافت جس لفظ سے بھی آپ تعبیر کرنا چاہیں وہ ایک ورثہ ہوتا ہے جو پرانی نسل نئی نسل کو منتقل کرتی ہے اور نئی نسل اس ثقافتی سرمایہ تہذیبی ورثہ کی نسبت اپنے اندر ایک اعتماد پیدا کرتی ہے اور اس کے اندر ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی جو عنایات ہیں ان کو حاصل کرنے کے لئے منظم جدوجہد ہوتی ہے اس جدوجہد کے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تفصیل سے ثقافتی فضائل پر غور کیا جاتا ہے پوری جدوجہد کی جاتی ہے کہ خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں [illegible] منتقل کیا جاتا ہے پھر جب تک ہر نئی پود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے ثقافتی ورثہ کو ترقی دینے کے لئے جدوجہد کرتی رہے اس وقت تک وہ اس کی امین ہے اور اس کے بعد وہ اسے نئے وارثوں کو ورثہ کے طور پر منتقل کرتی ہے اب اگر ہم اس انداز سے غور کریں کہ دین اور کلچر کے اندر کیا تعلق ہے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ کلچر یا ثقافت دراصل "ملت" یا معمول بر دین" ہے جس میں یہ بھی امکان ہے کہ انسانی کمزوریوں کی بنا پر انحراف کی راہ پیدا ہو جائے۔ لیکن اگر معیار پر نظر رہے تو اس انحراف کو دوبارہ صحیح معیار کی طرف لوٹانے کی ہر کوشش جاری رہتی ہے۔ جس طرح انسان کے جسمانی وجود میں تعمیر و تخریب کے دو نظام بیک وقت کام کرتے رہتے ہیں بالکل اسی طرح معاشرہ کے اندر ایک تعداد مفاد پرستوں کی ہوتی ہے جن کی کوشش تخریبی ہے۔ یہ تعمیری جدوجہد سے ہٹ کے اپنے ذاتی اور ادنیٰ مفادات کی خاطر منظم جدوجہد کرتے ہیں۔ اس کا تدارک صحت مند تنظیم کرتی رہتی ہے جو اسی معاشرہ کے اندر سے ابھرتی ہے۔ پھر ایک تصادم معاشرہ کے باہر سے بھی درپیش ہوتا ہے۔ اگر تخریب کی وہ سعی جو معاشرے کے اندر سے کی جا رہی ہے کامیاب ہو جائے اور تعمیری جدوجہد کرنے والے اتنے مضمحل ہو جائیں کہ اپنے مدعا کو بروئے کار نہ لا سکیں تو معاشرے کی تہذیب و ثقافت اور کلچر کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ اندرونی اور بیرونی تصادم کا تدارک قوت کے ساتھ کر سکیں تو پھر اس معاشرہ کو زوال نہیں ہوتا۔

ایک اور صورت یہ ہے کہ ہر دور میں اسباب اختلال مختلف اور نئے ہوتے ہیں اور ان کے پیش نظر اس تدارک مخصوص انداز سے کرنا درکار ہوتا ہے اگر خالص روایت پسندی کی بنیاد پر کوئی ذہن قدامت پرستی اختیار کرلے اور وہ اس احتیاج کا ش کرے کہ بدلے ہوئے حالات میں موثرات تخریب اور بے نظامی پیدا کرنے والے مفسدات کا تدارک کس انداز سے ہوگا تو پھر اس کے اندر ایک جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ جمود آج ہمارے معاشرہ میں ایک حقیقت بن چکا ہے اور اس جمود کو جدید ذہن لادینی انداز سے توڑنا چاہتا ہے اور راسخ العقیدہ انداز فکر رکھنے والا ذہن یہ سمجھتا ہے کہ اگر کوئی بے چینی اور سعی جو تعمیری جدوجہد کرنے کے لئے درکار ہے ہم اب اپنے اندر پیدا کرلیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے بچے کھچے فضائل بھی نابود ہو جائیں۔ اس لئے وہ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح جو باقی رہ گیا ہے اسی کو بچائے جائیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر دور میں اختلال کے جو اسباب ہیں وہ مختلف ہوں۔ مثلاً موجودہ دور میں ہمیں دو گونہ گو خطرات درپیش ہیں۔ ایک تو ہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مغربی فکر کے حملے سے دوچار ہیں۔ دوسرے ہم پر مغرب کی سیاست کا حملہ ہے۔ مغرب ایک تو سیاسی لحاظ سے ہر ملک فتح کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے اپنی فکر سے اسلامی تہذیب پر غلبہ پانا چاہتا ہے۔ یہی دونوں خطرات ہمیں اس دور میں بھی ملتے ہیں جب مسلمانوں پر سب سے پہلے یونانی فکر کا حملہ ہوا تھا اور اس کے فوراً بعد ہی آہستہ آہستہ سیاسی اختلال پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بغداد کی تباہی ایک سیاسی واقعہ ہے۔ اسپین میں مسلمانوں کی تباہی بھی ایک سیاسی واقعہ ہے۔ اس سے قبل یونان کی فکر کا جو حملہ تھا بغداد میں عباسیوں کے دور میں وہ ایک بہت بڑی فکر تھی۔ اس کو آگے بڑھانے کے لئے اس وقت مسلمانوں میں جو طرزِ فکر پیدا ہوئی بالکل اسی قسم کا ردِعمل آج ہمارے ہاں پیدا ہو رہا ہے۔ اس میں بعض لوگوں نے بالکل یونانی فکر کے سامنے سپر ڈال دی تھی اور بعض لوگوں نے اس کی اہمیت سے بالکل ہی انکار کر دیا تھا یہی اس زمانہ میں ہوا ہے اور بعض لوگ اب بھی سازگاری کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسائل کی نوعیت بنیادی طور پر بالکل تبدیل نہیں ہوتی۔

اسلام ایک ایسا معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے جو نوعِ انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔ اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد معتزلہ کے لئے قرار دئے گئے اسلام کے نقطۂ نگاہ سے یہ ضروری تھا کہ مبلغین اسلام اپنے عقائد دوسروں کو تلقین کرنے سے پہلے یہ اہتمام کریں کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان اشتراک فی العلم میسر آسکے تاکہ ان کے عقائد کا ابلاغ زیادہ موثر ہوتا اور ایسی اقوام جن میں فلسفیانہ انداز سے غور و فکر کرنے کی روایت قائم تھی ان میں اسلامی عقائد کا تلقین کرانا اور تسلیم کرانا سہل ہو۔ معتزلہ کے مخاطب مجوسی تھے اور ان کے ہاں فلسفیانہ اندازِ فکر موجود تھا۔ معتزلہ نے نمونہ علم میں یکسانی اور اشتراک فی العلم پیدا کرنے کی غرض سے فلسفیانہ غور و فکر کا یہ انداز اختیار کیا تھا چونکہ قرآن مجید میں عقل سے کام لینے اور جگہ جگہ غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے تو اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا کہ معتزلہ یہ تسلیم کر لیں کہ عقلِ انسانی حقائق کو سمجھنے کی استعداد رکھتی ہے۔ اسی بناء پر ہم نے مستشرقین کے کہنے سے یہ تسلیم کر لیا کہ عقل نظری اور خالصتاً عقلِ نظری ہی حقیقت کو سمجھنے کی استعداد رکھتی ہے یہ نظریہ افلاطون کے ہاں ایک اصول اولیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے ہمیں یہ مغالطہ لگا کہ ہم نے یونان کے فلسفیانہ اندازِ فکر کو قبول کر لیا حالانکہ جو بھی فلسفیانہ مسائل پر غور کرے گا اسے یہ تسلیم کرنا ہی ہو گا کہ حقیقت کو سمجھنے کی کوئی نہ کوئی استعداد انسان کے اندر ہے اور وہ عقل ہو سکتی ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ہم یونانی فکر کے زیرِ اثر آگئے تھے یہ بالکل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلط ہے۔ بیت الحکمۃ وغیرہ کے تراجم مامون کے زمانہ میں ہوئے ہیں اور تراجم کا ہونا یونانی فکر کی اشاعت شروع ہونے کا سبب [illegible] ہے۔ فلسفیانہ فکر کی نشو و نما اور مسلمانوں میں فلسفیانہ فکر کے تقاضے کے اظہار سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ دوسری تہذیبوں نے اس سلسلہ میں کیا کیا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جو چیلنج اسلامی تہذیب کو اس دور میں آیا وہ فکری چیلنج ہے۔ اس کے جواب کے لئے وہ کیا طریقے اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً میرے ذہن میں جہاں تک بات ہے وہ یوں ہے کہ یہ کلامی قسم کے مسائل جو تھے وہ ایک عرصہ تک مسلمانوں میں چھیڑتے ہوئے ڈرتے رہے۔ اس سے پہلے کے مفسرین جو ہیں یعنی خلفائے عباسیہ کے دور سے قبل کے مفسرین۔ ان کی تفسیروں میں آپ یہ نہیں پائیں گے کہ وہ جو حروف مقطعات ہیں یا وہ دوسرے اس قسم کے قرآن مجید میں متشابہات ہیں ان کو روکنا چاہتے ہیں۔ بلکہ چھیڑنا نہیں چاہتے جب یونانی فکر کا حملہ ہوا اور مسلمانوں کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوئے کہ مذہبی معتقدات کی فکری اساس کیا ہے؟ دین سے متعلقہ مسائل میں خالص نظری رجحان کا تقاضا یہ ہے فلسفیانہ انداز کے غور و فکر کی نشو و نما ہو۔

مسلمانوں میں فلسفیانہ فکر کے آغاز کو یونانی فکر کے حملے کا نتیجہ کہنا صحیح نہیں۔ بلکہ مسلمانوں میں فلسفیانہ فکر کا تقاضا پیدا ہونا (جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے) سبب ہے اور یونانی افکار کی طرف مسلمانوں کا توجہ کرنا اس کا نتیجہ ہے یونانی فکر کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حملے سے تعبیر کریں تو اس کے جواب میں مسلمانوں کا ردعمل انفعالی نہیں بلکہ فاعلانہ ہے اور انھوں نے یونانی فکر کی ترجمانی نہیں اس کی تطہیر بھی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی سطح پر صدیوں تک ذہنی اور فکری امامت اُن کے ہاتھ میں رہی آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب ہمارے مستعمراتی نظام نے غلبہ پایا تو ہم نے مستعمراتی نظام کو قبول کیا۔ کیا اس نظام میں اپنے آپ کو منوانے اور مفید ثابت ہونے کا کوئی پہلو تھا یا نہیں؟ بیرونی حملوں کا جواب دینے کے لئے اس وقت جو ردعمل تھا آج بھی اسی طرح کا ردعمل ہے مگر دونوں ادوار میں نازک سا فرق ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہم بین الاقوامی سطح پہ اس دور میں غالب اور مضبوط تھے اور ہماری حیثیت یہ نہیں تھی کہ دوسرے ہم کو مضمحل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ اور آج ہماری حالت یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ہم اضمحلال میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح دونوں ادوار کی نفسیات میں بھی فرق ہے [illegible] یونانی [illegible] کو قبول کر لیا تھا مسلم معاشرہ میں ان کا کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقام نہیں رہا تھا اس لئے کہ سوادِ اعظم اور مسلمان جمہور نے اسے کبھی وہ عظمت اور مقام نہ دیا جو کتاب وسنت اور روایتی اندازِ فکر کو حاصل رہا تھا۔ آج بھی صورتِ حال یہی ہے کہ عوام کی وفاداری اسلام ہی سے ہے اور وہ تمام لوگ جو تجدید پسندی کے انداز میں سوچ رہے ہیں وہ اپنا اثر قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں بلا شبہ وہ مغربی انداز میں فکر سے سازگاری پیدا کرنے کی جتنی سعی کریں گے اتنا ہی ہماری زندگی کے اوپر مخالفین کی گرفت مضبوط کرتے چلے جائیں گے۔ دراصل یہ سمجھتے نہیں پاتے کہ اصل مسئلہ کیا ہے رہا سازگاری پیدا کرنا تو یہ اس مسئلے کا علاج نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک موت ہے جس طرح شیر گھاس کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا اور بکری گوشت کھا کر اور خون پی کر زندہ نہیں رہ سکتی بالکل اسی طرح مختلف نظامہائے فکر میں جو تہذیبیں نشوونما پاتی ہیں وہ کسی نامانوس تصور کے سہارے اپنے آپ کو کبھی مضبوط نہیں کر سکتیں بلکہ جب ان کے اندر مغائر تصورات راہ پاتے ہیں تو وہ ان کے اختلال کا موجب بن جاتے ہیں۔ اگر خود معاشرہ کے اندر سے ان کا تدارک نہ ابھرے تو ان کا زوال ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بیرونی فکری حملوں کے جواب میں جو ردِ عمل پیدا ہوتا ہے وہ اس بنا پر مختلف ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں جب یونانی فکر نے مسلمانوں پر حملہ کیا تھا مسلمان سیاسی لحاظ سے مقتدر تھے۔ آج ایک بڑا بنیادی فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہن پر مغربی فکر کا غلبہ ہے۔ وہ مغربی افکار سے ان کی برتری کی بنا پر مغلوب نہیں بلکہ اپنے سیاسی ضعف کی وجہ سے مغلوب ہو گئے ہیں۔ صرف رومی فاتحوں اور یونانی مفتوحوں کے باب میں یہ بات درست نہیں بلکہ خود آپ کی اپنی تاریخ بھی شاہد ہے کہ چنگیز خان اور ہلاکو خان نے آپ کو تاراج کیا تھا اس کے بعد ان کی نسل مسلمان ہو گئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ آپ کے نظامِ فکر کی برتری کی وجہ سے اس کے آگے سپر ڈال ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بہت اعلیٰ تہذیب و تمدن کی حامل قوم اگر جانبازی کے ولولے سے عاری ہو جائے تو غیر مہذب بربریت کی حامل وحشی عوام کے ہاتھ سے فنا ہوتی ہے۔ تاہم فکر اتنی بڑی قوت ہے کہ سیاسی لحاظ سے ایک فاتح قوم اپنی مفتوح قوم کے فکری غلبے کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ کمال اس فکری عظمت کا ہے جو سر فروشی اور جانبازی کا ولولہ رکھتی ہو۔ اگرچہ آج جب ہم سیاسی لحاظ سے اس حیثیت میں نہیں ہیں جس میں ہم اپنے دورِ اقتدار میں تھے اس کے باوجود اگر مغربی فکر کے مقابلے میں ہم اپنی فکری عظمت کا شعور برقرار رکھ سکیں تو ہمارے اس دور کے اور اُس دور کے ردِ عمل میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ لیکن آج ہمارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اضمحلال کی وجہ یہ ہے کہ خود ہمارے روایتی اندازِ فکر کے نمائندے اپنی جگہ اضمحلال کا شکار رہیں جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ جدید ذہن اور راسخ العقیدہ ذہن کے نمائندوں کے درمیان ایک مماثلت ہے کہ دونوں اسلام کے مستقبل سے مایوس ہیں اضمحلال کو ہماری پستی میں بہت بڑا دخل ہے اور آپ یہ سوچیں کہ اس وقت دنیا میں ایک تو مغربی فکر ہے اور دوسری طرف اشتراکی۔ ان دو کا اثر ایک طرف، جو انتشار اور پراگندہ خیالی آپ کے اپنے اسلامی حلقے کے اندر ہے اس میں آپ غور کریں کیا اس اضمحلال کے ساتھ اس پراگندگی کے ساتھ آپ اس چیلنج کا جواب ہو سکتے ہیں؟ آپ یہ دیکھیں کہ اگر آپ کسی مسجد کے خطیب سے جا کر پوچھیں کہ اشتراکیت کیا ہے شاید وہ وہی جواب دے گا جو مارکس نے دیا تھا۔ لیکن آپ تمام خطیبوں سے اور مساجد کے ائمہ سے جا کر پوچھیں کہ اسلام کیا ہے اور اس کا جواب ایک سطر میں مانگیں تو آپ یقین کریں کہ ہر ایک کا جواب مختلف ہوگا۔ کیا اس پراگندہ خیالی کے ساتھ ہم اس چیلنج کا جواب ہو سکتے ہیں؟ اس کے لئے تو ہمیں نئے سرے سے سعی کرنا پڑے گی اور ہمارے راسخ العقیدہ فکر کے ذہن میں خود قرآن مجید کے بارے میں جو التباس ہے اُسے دور کرنا پڑے گا۔

بلاشبہ جب تک ہم اپنے افکار کی بنیاد پر کوئی منظم جدوجہد ایسی نہیں کریں گے۔ جس میں ہمیں یہ یقین بھی حاصل ہو کہ جو کچھ ہم کرنے چاہتے ہیں اسے حتماً اور یقیناً کر سکیں گے، اس وقت تک ہماری جدوجہد میں جان اور یقین پیدا نہیں ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ یقین کیوں مفقود ہوا اور کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک ہم اس اعتبار سے اپنے فکر کو کسی خاص سوال کے تحت مرکوز نہ کریں اس وقت تک یہ پتہ نہیں چلے گا کہ اس مسئلہ کے بارے میں مختلف خطوط کے اندر کیا انداز پیدا ہوا اور اگر وہ مختلف ہے تو اس کے اسباب کیا تھے اور کیونکر ہوئے۔ اسلام ایک ایسا معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے جو نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔ اور اخلاق جدوجہد کرنے اور روحانی افراد پر مشتمل ہو جن کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد و معاشرہ ہر قسم کے خوف اور غم سے محفوظ رہیں اور اس معاشرہ میں بنائے استحکام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری ہے۔ اب یہ سوال لازماً پیدا ہوگا کہ نوع انسانی ...... کی وحدت کے تصور پر مبنی معاشرہ کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تمام گروہ اور تمام جماعتیں اور وہ تمام اجتماعی ہیئتیں جو محدود وفاداریوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اوپر قائم ہوتی ہیں وہ معاندانہ ہوتی ہیں اور تمام دوسری تنظیمات اور گروہوں کے ساتھ ان کا ذہن معاندانہ ہوتا ہے۔ قرآن سے یہ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری نوع انسانی پہلے ایک امت تھی اس کے بعد ان کے مفادات نے ان میں اختلاف ڈلوا دیا اور پھر وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اسلام نوع انسانی کو از سرِ نو صحیح بنیادوں پر منظم کرنا چاہتا ہے اس لئے ہمیں نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی فلسفہ کی ضرورت ہے۔ آج کی دنیا میں محدود وفاداریوں کی بنیاد پر جو گروپ اور جو تہذیبیں قائم ہوئی وہ اس مسئلہ پر اسلام سے متصادم ہیں کیونکہ کچھ بے انصافیاں اور بے نظامیاں خود محدود اور وفاداریوں کے اوپر قائم ہونے والے گروہ کے اندر پائی جاتی ہیں اور ان کی بنا پر جو لوگ مظلوم اور محروم ہیں ان کے لئے اسلام میں ایک کشش ہے۔ ہمارا دین اور سیاست بالکل ایک ہے اور اس کے لئے جو جو مفادات مہلک اور بے معنی ہیں ان کا تدارک کرنا بیک وقت دین بھی ہے اور سیاست بھی۔ عالم اسلام کے کسی حصہ میں بھی جب تک ہم نے مغربی تصورات کو قبول نہیں کیا تھا پوزیشن یہ تھی کہ کوئی مسلمان چاہے اس علاقہ کی زبان جانتا ہو یا نہ جانتا ہو اپنے آپ کو اجنبی نہیں سمجھتا تھا۔ توحید کا عقیدہ ایک سطح پہ تو ایک CONCEPT تصور ہے اور جب توحید کو محسوسات کے ساتھ سازگار بنائے اور ان میں باہمی ربط پیدا کرنے کی سعی کی جائے اور توحید کا اثر جب محسوس حقائق پر لایا جائے گا تو وہ یہ ہوگا کہ نوع انسانی کو ایک وحدت قرار دیا جائے عبودیت کا ایک طرف اخلاقی تقاضا ہے یعنی عقلی اور روحانی تقاضا جس سے نوع انسانی کے لئے دل سوزی اور فلاح و بہبود کی آرزو پیدا ہوگی اور دوسری طرف معاشی مفاد ہے چنانچہ انفرادی اور اجتماعی IDEALISTIC CULTURE کا مطالبہ اس طرح پورا ہوگا کہ اخلاق اور معیشت کے درمیان جوابی اضافی، مستفاضی ربط کو تسلیم کیا جائے۔ اسے متعین کیا جائے۔ تو جب قرآن مجید نیکی کی تعریف اس طرح کرے کہ لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون یعنی ''انفاق'' فاعل اخلاق سے مستفید ہونے والے کی وہ معیشت ہو اور یہ باہمی، جوابی، اضافی مستفاضی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہوں تب ہی IDEALISTIC CULTURE کا انداز پیدا ہوگا اس کے بغیر نہیں۔ اسلام کی مذہبیت خود اپنی جگہ مکمل ہے اور اس کی محتاج نہیں کہ حسی تہذیب اور تخیلی تہذیب کو تصورات کو جمع کیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے تو دونوں کے نقائص ہی چند در چند ہوتے جائیں گے۔ اسلامی تہذیب بجائے خود کامل ہے اور اس سے انحراف کی وجہ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے تہذیب ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ آج اگر ہم نے خود اپنے معاشرہ کے اندر حسی تہذیب اور تخیلی تہذیب دونوں کو الگ کر دیا ہو تو اسلام کی اس خصوصیت کی نفی اور اسلام کے خلاف تخریبی انداز ہمارے اپنے اقدام سے پیدا ہو گا۔ قطع نظر اس کے کہ دوسروں نے کیا کیا ہو اور ہم نے یہ طرز عمل مستعمراتی نظام کے زیر اثر اختیار کیا ہے۔

صحیفۂ حکمتِ قرآن

اغراض و مقاصد

۱۔ قرآن حکیم تمام بنی نوع انسان کے لئے سرمایۂ رشد و ہدایت ہے، اس کتاب حکمت کو خود رب العزت نے زمانۂ نزول سے لے کر قیامت تک ہر دور کے تقاضوں کے لئے کافی و شافی فرمایا ہے۔ اس گنجینۂ حکمت کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی اور اس صحیفۂ ہدایت کے معانی و مطالب کی تفہیم کا کام شروع سے جاری ہے۔ اور چونکہ ہر دور کے تقاضے الگ الگ ہیں اس لئے ہر دور میں اس پر غور و خوض کی احتیاج رہی ہے اور قیامت تک رہے گی۔

۲۔ اب جب کہ علم انفرادی سطح سے بلند ہو کر سماجی سطح تک آ گیا ہے، یہ انتہائی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تفہیم قرآن کے سلسلے میں بھی اجتماعی کوششوں کو بروئے کار لایا جائے۔ اور اس ضمن میں مختلف اداروں میں جو کاوشیں ہوئی ہیں اُن کو یکجا کر کے موجودہ مسائل کا حل ڈھونڈنے کی سعی کی جائے۔

۳۔ "صحیفۂ حکمتِ قرآن" کے اجرار کا مقصد یہ ہے کہ قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے کا کام فرقہ وارانہ سطح سے بالاتر ہو کر خالص علمی سطح پر سرانجام دیا جائے۔

۴۔ مطالعۂ حکمتِ قرآن کا ایک مرکزی حلقہ قائم کیا گیا ہے جس میں قرآن حکیم کے مضامین پر خالصتاً تحقیقی نقطۂ نظر سے کام کیا جائے گا اور حاصلاتِ مطالعہ کو یکجا کرنے کی سعی کی جائے گی۔ ملک کے طول و عرض میں مختلف قرآنی اور دینی حلقوں کو اس بات کی دعوت دی جاتی ہے کہ وہ تفہیم قرآن کے سلسلے میں اہم نکات کو مضامین کی شکل ہی میں نہیں بلکہ اشارات کی صورت میں مرکزی حلقہ کو ارسال فرمائیں۔

۵۔ واضح رہے کہ مطالعۂ حکمتِ قرآن کے اس مرکزی حلقے کو دوسرے حلقوں پر کسی قسم کی بالادستی حاصل نہیں ہو گی۔ بلکہ یہ حلقہ ملک کے دوسرے حلقوں کے درمیان ایک نوع کے الحاق کی صورت قائم رکھنے کے لئے کوشاں رہے گا۔

۶۔ انفرادی سطح پر معاونت فرمانے والے حضرات کے لئے بھی حلقۂ مطالعۂ حکمتِ قرآن ممنون ہو گا اور تفہیم قرآن کے سلسلہ میں ان کے خیالات کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۷۔ دوسرے ممالک میں تفہیم قرآن کے سلسلے میں جو کوشش ہو رہی ہے ان کو بھی یکجا کرنے کی سعی کی جائے گی۔

۸۔ اندرونِ ملک شائع ہونے والے وہ تمام دینی رسائل و جرائد جو مرکز کو بھیجے جائیں گے مرکز ان کے مضامین کے اہم نکات اور اقتباسات کو صحیفۂ حکمتِ قرآن میں نمایاں طور پر پیش کرے گا۔

۹۔ صحیفۂ حکمتِ قرآن کے مضامین دوبارہ اشاعت، نقل، اخذ یا علاقائی زبانوں میں ترجمہ پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ البتہ اگر صحیفہ کا حوالہ دے دیا جائے تو یہ امر ہمارے لئے باعثِ ممنونیت ہو گا۔

قرآن فہمی کے لئے

ماہنامہ

"حکمتِ قرآن"

لاہور

کا مطالعہ ضرور کریں

آج ہی تین روپے سالانہ چندہ بھیج کر مستقل خریدار بن جائیں

یا

اپنے قریبی بک سٹال سے خرید فرمائیں

منیجر ماہنامہ "حکمتِ قرآن"

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس

۴۔ فرینڈز کالونی، ملتان روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com